ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1915

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :معاصر اسلامی فکری مسائل • (1915) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ / عربی

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر ۲) یونٹ 5 تا(9

کل نمبر • 100 . کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں؛ بعینہٖ نقل کرنا امتحانی قواعد کے خلاف ہے۔

سوال نمبر ۱ :جدید سائنس کی فکری بنیادیں :الحاد و تشکیک کا سبب 20) نمبر(

سوال نمبر ۱ ۔ جدید سائنس کی فکری بنیادیں الحاد یا تشکیک کا سبب کیوں بنتی ہیں؟

تعارف

جدید سائنس نے انسان کو کائنات کے بارے میں غیر معمولی معلومات اور بے پناہ تکنیکی طاقت عطا کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک عجیب صورتحال بھی پیدا ہوئی ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ الحاد) خدا کے وجود سے انکار (اور تشکیک) دینی حقائق کے بارے میں شک و تذبذب (میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ سائنسی طریقہ کار خود نہ خدا کا انکار کرتا ہے نہ اثبات؛ پھر بھی عوام اور حتیٰ کہ بہت سے سائنسدان سائنس کو مذہب کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں۔ اس

کی وجہ سائنس کی تجربی دریافتیں نہیں بلکہ وہ فکری و فلسفیانہ بنیادیں ہیں جن پر مغرب میں جدید سائنس کی عمارت کھڑی ہوئی۔ ذیل میں ان بنیادوں اور ان کے الحاد و تشکیک پیدا کرنے کے اسباب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

فکری بنیاد اول :مادیّت اور میکانکی تصورِ کائنات

نشاۃِ ثانیہ اور روشن خیالی کے دور میں سائنس کے ساتھ ایک مخصوص فلسفہ بھی پروان چڑھا جسے مادیت (materialism)کہا جاتا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کی کامیابی نے یہ تاثر پیدا کیا کہ کائنات ایک عظیم مشین ہے جو طے شدہ طبعی قوانین کے مطابق خود بخود چل رہی ہے۔ لاپلاس نے نیوٹن کے نظام کو اس حد تک پھیلایا کہ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے نظام میں خدا کی کیا جگہ ہے تو اس نے کہا" :مجھے اس مفروضے کی ضرورت نہیں"۔ یہ جملہ دراصل اس فکری بنیاد کا اظہار ہے کہ جب ہر چیز کی علت طبعی قوانین سے بیان ہو سکتی ہے تو خالق کا تصور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو — خواہ اس کا سائنسی درجہ کچھ بھی ہو — عام ذہن میں اس طرح پیش کیا گیا کہ زندگی کی تخلیق میں خدا کا کردار ختم ہو گیا ہے۔ جب یہ فلسفہ نصابی کتابوں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عام ہوتا ہے تو طالب علم سائنس پڑھتے ہوئے بے شعوری طور پر مادی فلسفہ بھی قبول کر لیتا ہے، اور یہی قبولیت بتدریج الحاد میں بدل جاتی ہے۔ یہاں یہ فرق سمجھنا ضروری ہے کہ یہ الحاد سائنسی دریافت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ جوڑے گئے فلسفے کا نتیجہ ہے۔

فکری بنیاد دوم :تجربیّت اور علم کی حد بندی

جدید سائنس کی دوسری بنیاد تجربیت (empiricism) ہے، یعنی صرف وہی علم قابلِ قبول ہے جو حواس و تجربے سے ثابت ہو۔ یہ اصول سائنسی تحقیق کے لیے مفید ہے لیکن جب اسے کل علم کا واحد معیار بنا لیا جاتا ہے تو غیب کی پوری دنیا — خدا، فرشتے، وحی، آخرت، روح" — غیر سائنسی "کہہ کر علم کے دائرے سے باہر کر دی جاتی ہے۔ اگست کومت کے اثباتیّت (positivism) فلسفے نے دعویٰ کیا کہ انسانیت کا ذہن لاھوتی اور مابعد الطبیعی مراحل سے گزر کر اب سائنسی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، لہٰذا مذہب بچنے کی سوچ ہے۔ جس ذہن میں یہ بنیاد بیٹھ جائے، وہ وحی کو علم کا ذریعہ ماننے سے انکار کر دیتا ہے، کیونکہ وحی تجربہ گاہ میں ثابت نہیں ہو سکتی۔ یوں سائنس کا طریقِ کار (methodological naturalism)عملی فلسفے (metaphysical naturalism) میں بدل جاتا ہے :سائنسدان تحقیق

میں طبعی اسباب تلاش کرتا ہے، یہ اس کا حق ہے؛ مگر جب یہ کہا جائے کہ طبعی اسباب کے علاوہ کچھ موجود ہی نہیں، تو یہ سائنس نہیں بلکہ الحادی فلسفہ ہے۔ تشکیک کی ابتداء بھی یہیں سے ہوتی ہے کہ مذہبی حقائق" ثابت شدہ" نہیں لگتے۔

تشکیک کے نفسیاتی و تاریخی اسباب

الحاد کے علاوہ سائنس تشکیک کا سبب بھی بنتی ہے اور اس کے اسباب میں تاریخی عوامل بڑے اہم ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں چرچ نے سائنسی حقائق — مثلاً زمین کے گردش کرنے — کی مخالفت کی اور گلیلیو جیسے سائنسدانوں کو سزائیں دیں۔ اس تصادم نے مغربی ذہن میں یہ معادلہ قائم کر دیا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے دشمن ہیں؛ جو سائنس کو مانے وہ مذہب سے دور ہو جائے۔ جب یہی تصادم اسلامی معاشروں میں درآمد کیا گیا تو یہاں بھی نوجوانوں نے سمجھ لیا کہ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب مذہب پر شک کرنا ہے، حالانکہ اسلامی تاریخ میں سائنس و مذہب کا یہ تصادم کبھی موجود نہ تھا۔ دوسرا سبب سائنس کی تبدیلی پذیری ہے۔ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں، نیوٹن کے بعد آئن سٹائن آیا، اور ہر نئی دریافت پرانی تشریح کو بدل دیتی ہے۔ جب ایک شخص مذہب کو بھی اسی ترازو میں تولتا ہے تو وہ مذہبی حقائق کو بھی" عارضی "سمجھ کر شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تیسرا سبب سکند و بازار کی تشہیر ہے : مقبول سائنسی مصنفین سائنس کو الحادی لہجے میں پیش کرتے ہیں، جس سے تشکیک ایک" روشن خیالی "کی علامت بن جاتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر :سائنس اور ایمان میں کوئی تصادم نہیں

اسلامی نقطۂ نظر سے سائنس کا مطالعہ خود ایمان کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے، کیونکہ قرآن نے کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی ہے" :بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں) "آل عمران(190 :۔ مسلمان سائنسدانوں — ابن الہیثم، البیرونی، خوارزمی — نے تجربی طریقہ کار کی بنیاد رکھی اور ان کے لیے سائنس اللہ کی قدرت کو سمجھنے کا نام تھا۔ آج بھی بڑے سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد خدا پر ایمان رکھتی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ الحاد سائنس کی لازمی پیداوار نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مغربی سائنس کو اس کے الحادی فلسفیانہ لبادے سمیت درآمد کیا گیا۔ حل یہ ہے کہ سائنسی تعلیم میں طریقِ کار اور فلسفے کا فرق

واضح کیا جائے، طالب علم کو بتایا جائے کہ سائنس" کیسے "کا جواب دیتی ہے جبکہ" کیوں "اور" کس نے "کے سوالات اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ اس شعور کے ساتھ سائنس ایمان کی دشمن نہیں بلکہ مددگار بن جاتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ جدید سائنس کی مخصوص فکری بنیادیں — مادیّت و میکانکی تصورِ کائنات، تجربیت کو کل علم کا واحد معیار بنانا، اور تاریخی طور پر چرچ و سائنس کے تصادم کا ورثہ — اسے الحاد و تشکیک کا سبب بناتی ہیں۔ اصولاً سائنسی طریقہ کار خدا کے وجود کے بارے میں غیر جانبدار ہے؛ الحاد اس فلسفے سے پیدا ہوتا ہے جو سائنس کے نام پر گھڑا جاتا ہے۔ جب تک سائنس کو اس کے اصل دائرے میں رکھ کر پڑھایا جائے اور غیب کے علم کے ذریعے کے طور پر وحی کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے، سائنس ایمان کے خلاف نہیں جاتی۔ قرآن کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ کائنات کا مطالعہ خالق کی معرفت کا ذریعہ بنے، نہ کہ اس سے انکار کا بہانہ۔

سوال نمبر ۲ :معاصر معاشرے میں اخلاقی اقدار کے زوال کے بنیادی اسباب 20) نمبر(

سوال نمبر ۲۔ معاصر معاشرے میں اخلاقی اقدار کے زوال کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟

تعارف

آج کے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ مادی پسماندگی نہیں بلکہ اخلاقی زوال ہے۔ سچائی، امانت، دیانت، حیا، بردباری، ایثار اور والدین و اساتذہ کا احترام جیسی اقدار تیزی سے کمزور ہو رہی ہیں، جب کہ جھوٹ، دھوکا دہی، خود غرضی، بدعنوانی، بے حیائی اور تشدد عام ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ زوال اچانک نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے کئی باہم جڑے اسباب ہیں — بعض فکری، بعض معاشی، بعض تربیتی اور بعض ابلاغی۔ اگر اسباب کی درست تشخیص نہ ہو تو اصلاح کی کوششیں سطحی رہ جاتی ہیں۔ ذیل میں معاصر معاشرے میں اخلاقی اقدار کے زوال کے بنیادی اسباب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سبب اول :مادہ پرستی اور مصرفیّت

معاصر زوال کی سب سے بڑی جڑ مادہ پرستی ہے۔ جب معاشرے میں انسان کی قدر اس کی دولت، گاڑی، گھر اور سماجی رتبے سے ناپی جانے لگے اور کامیابی کا واحد پیمانہ پیسہ بن جائے تو اخلاق پیچھے رہ جاتا ہے۔ صارفیت (consumerism) کی ثقافت اشتہارات کے ذریعے مسلسل نئی خواہشات پیدا کرتی ہے؛ ان خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان جائز و ناجائز کا فرق بھول جاتا ہے۔ اسی ذہنیت سے رشوت، سود خوری، ملاوٹ، قیاس بازی اور قسطوں کی زندگی عام ہوتی ہے، اور پیسے کی دوڑ میں رشتے، وعدے اور امانتیں سب قربان ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے اسی بیماری کی طرف اشارہ کیا تھا" :کثرت)کی طلب (نے تمہیں غافل کر دیا) "التکاثر(1 :۔ مادہ پرست معاشرے میں حاسد و مسابقت بڑھتی ہے اور قناعت و شکر جیسی اقدار ختم ہو جاتی ہیں، جس کا لازمی نتیجہ اخلاقی زوال ہے۔

سبب دوم :خاندانی نظام کی کمزوری اور تربیت کا فقدان

اخلاق کی پہلی درسگاہ خاندان ہے۔ جب گھروں میں والدین روزگار اور مصروفیت کی وجہ سے بچوں کو وقت نہ دیں، مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ کر بچے محبت و نگرانی سے محروم رہیں، اور تربیت کا کام اسکول، ٹیوشن اور موبائل کے سپرد ہو جائے تو کردار سازی کا عمل رک جاتا ہے۔ بچہ اخلاق کتابوں سے نہیں بلکہ مشاہدے سے سیکھتا ہے؛ اگر وہ گھر میں جھوٹ، غیبت، بڑوں کی بے ادبی اور والدین کے باہمی جھگڑے دیکھے گا تو یہی اس کا" نصاب "بنے گا۔ مزید یہ کہ طلاق کی بڑھتی شرح اور گھریلو تشدد بچوں کی نفسیات کو تباہ کر کے انہیں معاشرے کے خلاف بغاوت پر مائل کرتا ہے۔ دادی دادی اور بزرگوں کی صحبت جو کبھی تربیت کا قدرتی نظام تھی، وہ بھی جدید طرزِ زندگی میں ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یوں نئی نسل اخلاقی اقدار سے لیس ہونے کے بجائے صرف معلومات سے لیس ہو کر نکلتی ہے۔

سبب سوم :تعلیمی نظام میں کردار سازی کی عدم موجودگی

جدید تعلیمی نظام ڈگریاں تو دیتا ہے لیکن انسان نہیں بناتا۔ نصاب کا مقصد امتحان، نمبر اور نوکری تک محدود ہو گیا ہے؛ اساتذہ کا کردار معلوماتی منتقلی تک سکڑ گیا ہے اور استاد و شاگرد کا روحانی و اخلاقی رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ جب تعلیمی اداروں میں نقل کو" ہوشیاری"، جھوٹی حاضری کو معمول اور اساتذہ کی بے عزتی کو آزادی سمجھا جائے تو وہاں سے نکلنے والا نوجوان ڈاکٹر، انجینئر یا افسر بن کر بھی بدعنوانی سے باز نہیں آتا۔ مزید برآں دینی تعلیم کو نظام سے

بتدریج باہر کرتے جانے سے بچے کو بچپن میں وہ اخلاقی بنیاد نہیں ملتی جو قرآن و سیرت فراہم کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی بدعنوانی کے بڑے بڑے اسکینڈلوں میں ملوث پایا جاتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسئلہ تعلیم کی کمی کا نہیں، تربیت کی کمی کا ہے۔

سبب چہارم :ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور بے حیائی کی تشہیر

میڈیا آج معاشرے کا سب سے بڑا" استاد "بن چکا ہے۔ ٹیلی ویژن ڈراموں، فلموں اور سوشل میڈیا نے تشدد، دھوکا، سازش اور بے حیائی کو تفریح بنا کر پیش کیا ہے؛ جو نوجوان دن میں کئی گھنٹے یہ مواد دیکھتا ہے اس کے نزدیک یہی رویے" نارمل "بن جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارموں کی حرکیات بھی اخلاق دشمن ہیں :شہرت کے لیے جھوٹی نمائش، دوسروں کی پگڑی اچھالنا، نفرت انگیز تبصرے اور فحش مواد کی سہل رسائی نے حیا، پردے اور باہمی احترام کی اقدار کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ الگورتھم سنسنی اور انتشار کو فروغ دیتے ہیں کیونکہ اسی سے کاروبار چلتا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور شخصیات (celebrities) کو جوانوں کا آئیڈیل بنا دیا گیا ہے جن کی زندگی میں اخلاق کے بجائے نمود و نمائش نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں اخلاقی اقدار کا زوال کوئی حیرت کی بات نہیں رہتی۔

سبب پنجم :مذہبی تربیت سے دوری اور احتساب کا فقدان

اخلاق کی مضبوط ترین بنیاد خدا خوفی اور آخرت کا احتساب ہے۔ جب انسان یہ سمجھے کہ اس کے ہر عمل کا حساب ہونا ہے تو وہ تنہائی میں بھی گناہ سے بچتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے میں دینی عمل، مسجد و علماء سے تعلق اور آخرت کا شعور کمزور ہوا، اخلاق کی یہ اندرونی چوکیداری ختم ہوتی گئی۔ باقی رہا قانونی احتساب، مگر بدقسمتی سے معاصر معاشرے میں قانون کا نفاذ کمزور، غیر مساوی اور ساکن ہے؛ جب چھوٹا چور پکڑا جائے اور بڑا کرپٹ بچ نکلے تو عوام کے دلوں میں قانون و اخلاق دونوں کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سیاست و قیادت میں اخلاقی مثالیں ناپید ہیں؛ جب قائدین خود وعدہ خلافی، جھوٹ اور اقربا پروری میں ملوث ہوں تو عوام کے لیے اخلاق محض خطبوں کی زینت رہ جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غربت، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے معاشی دباؤ بھی انسان کو اخلاقی کمزوری پر مجبور کرتے ہیں، اگرچہ یہ اس کا جواز نہیں بن سکتے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ معاصر اخلاقی زوال کسی ایک سبب کا نہیں بلکہ ایک پورے نظام کی خرابی کا نتیجہ ہے :مادہ پرستی نے مقصد بدل دیا، خاندان کی کمزوری نے تربیت چھین لی، تعلیمی نظام نے کردار سازی چھوڑ دی، میڈیا نے بے حیائی کو عام کر دیا، دینی احتساب کا شعور کمزور ہوا اور قانونی احتساب غیر مؤثر رہا۔ ان اسباب کا علاج بھی ہمہ جہتی ہوگا : گھروں میں تربیت کی بحالی، تعلیم میں کردار سازی کی واپسی، میڈیا کی ذمہ دارانہ ضابطہ کاری، مسجد و علماء کے تربیتی کردار کی نشاۃ اور عادلانہ قانون کا نفاذ۔ اقدار کتابوں سے نہیں، زندہ مثالوں سے بنتی ہیں؛ جب معاشرے کی قیادت اور اہلِ خیر اخلاق کو عملی صورت دیں گے تو زوال کا یہ عمل رک سکے گا۔

سوال نمبر ۳ :جوہری و کیمیائی ہتھیار :انسانیت کے لیے اخلاقی خطرات 20) نمبر(

سوال نمبر ۳۔ جوہری اور کیمیائی ہتھیار انسانیت کے لیے کن اخلاقی خطرات کا باعث ہیں؟

تعارف

بیسویں صدی میں انسان نے ایسی تباہ کاری کے اسلحے ایجاد کیے جو پوری انسانی تہذیب کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔1945 ء میں ہیروشیما و ناگاساکی پر گرائے گئے ایٹم بموں نے لمحوں میں لاکھوں انسانوں کو جلا کر رکھ دیا، اور کیمیائی ہتھیاروں — زہریلی گیسوں — نے پہلی جنگِ عظیم سے لے کر حلبچہ اور غوطہ تک معصوم شہری آبادیوں کو نشانہ بنایا۔ سوال صرف یہ نہیں کہ یہ ہتھیار کتنے تباہ کن ہیں، بلکہ اخلاقی سوال بھی ہے :کیا انسان کو ایسے ہتھیار رکھنے، آزمانے اور استعمال کرنے کا اخلاقی حق حاصل ہے؟ یہ ہتھیار انسانیت کے لیے متعدد اخلاقی خطرات پیدا کرتے ہیں جن کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

خطرہ اول :غیر امتیازی و اجتماعی قتل — غیر جنگجوؤں کا قتلِ عام

اخلاقیاتِ جنگ کا سب سے بنیادی اصول جنگجو اور غیر جنگجو کے درمیان امتیاز ہے :جنگ لڑنے والوں سے لڑی جائے، نہ کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، کسانوں، مریضوں اور عام شہریوں سے۔ جوہری و کیمیائی ہتھیار فطرتاً" اندھے "ہیں؛ بم گرنے کے بعد تفریق نہیں کرتا کہ اس کے نشانے پر سپاہی ہے یا اسپتال کا مریض، اسکول کا بچہ ہے یا مسجد کا نمازی۔

ہیروشیما میں ہلاک ہونے والوں کی اکثریت عام شہری تھی۔ کیمیائی گیس ہوا کے رخ کے ساتھ دیہات و بستیوں میں پھیل جاتی ہے اور نسلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ایسے ہتھیاروں کا استعمال جنگی اخلاقیات کے اصولِ امتیاز اور اصولِ تناسب) کہ نقصان فوجی مقصد سے بڑھ نہ جائے (دونوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اخلاق لحاظ سے ایسے اسلحے کا محض" حوالگی " (deterrence)کے نام پر ذخیرہ رکھنا بھی اس نیت کو قبول کرنا ہے کہ وقت آنے پر اجتماعی قتل کیا جائے گا، جو کسی اخلاقی نظام میں جائز نہیں ٹھہر سکتا۔

خطرہ دوم :نسلوں اور ماحولیات پر طویل المیعاد اثرات

عام اسلحے کا نقصان جنگ کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، لیکن جوہری تابکاری اور کیمیائی زہر دہائیوں اور نسلوں تک تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ ہیروشیما و ناگاساکی کی تابکاری سے پیدا ہونے والے بچے برسوں معذوری و سرطان کا شکار ہوئے؛ ویتنام میں استعمال ہونے والے" ایجنٹ اورنج "کے اثرات آج تک وہاں کے بچوں میں نظر آتے ہیں؛ چرنوبل و فوکوشیما کے حادثات نے دکھا دیا کہ جوہری مادہ ماحول کو کس طرح مسموم کرتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ اس سے بھی بڑا جرم ہے کیونکہ اس میں ان نسلوں کو سزا ملتی ہے جن کا جنگ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اسلام نے جنگ میں بھی درخت کاٹنے، کھیت جلانے اور پانی کے ذخائر کو زہر آلود کرنے سے منع کیا ہے؛ نبی کریم ﷺاور خلفائے راشدین کی ہدایات میں فصلوں و مویشیوں کا تحفظ شامل تھا۔ جو ہتھیار پورے ماحولیاتی نظام (ecosystem)کو تباہ کر دے وہ زمین پر نسلِ انسانی کے علاوہ تمام جانداروں کے حقِ حیات کی بھی پامالی ہے۔

خطرہ سوم :خوف و دہشت کی دائمی نفسیات اور اخلاقی جمود

جوہری ہتھیاروں کا نظام" باہمی یقینی تباہی (Mutually Assured Destruction) "کے اصول پر قائم ہے، یعنی امن اس لیے ہے کہ ہر فریق دوسرے کی مکمل تباہی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ امن دراصل دائمی دہشت کا نام ہے۔ اخلاقی لحاظ سے اس کے نتائج گہرے ہیں :پوری نسلیں ایٹمی جنگ کے سائے اور خوف میں پروان چڑھتی ہیں؛ سیاسی قیادت" پہلے وار (first strike) "جیسی اخلاقی پستی پر سوچنے لگتی ہے؛ اور لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام کو" اسٹریٹجک ضرورت " کے سنگدل الفاظ میں معمول بنا دیا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی جمود (moral numbness) ہی سب سے بڑا خطرہ ہے کہ قتلِ عام جیسا فعل اعداد و شمار کی بحث بن جائے اور انسانی ضمیر اس پر بے حس ہو جائے۔ اسی طرح کیمیائی ہتھیاروں کی

موجودگی ہر تنازعے میں ان کے استعمال کا خدشہ پیدا کرتی ہے اور کمزور گروہوں کو بھی" غریب کا ایٹم بم "حاصل کرنے پر اکساتی ہے، جس سے انتشار پھیلتا ہے۔

خطرہ چہارم :وسائل کا ضیاع، اسلحے کی دوڑ اور انسانی فلاح کی محرومی

جوہری و کیمیائی پروگراموں پر دنیا بھر میں کھربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اخلاقی سوال یہ ہے کہ جن وسائل سے کروڑوں بھوکے انسانوں کو کھانا، مریضوں کو علاج اور بچوں کو تعلیم مل سکتی تھی، وہ ان ہتھیاروں پر کیوں صرف کیے جائیں جن کا کام صرف تباہی ہے؟ مزید برآں یہ ہتھیار اسلحے کی ایسی دوڑ چلاتے ہیں جس میں ہر ملک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں سلامتی کے بجائے عدم تحفظ بڑھاتا ہے۔ ان ہتھیاروں کی نگرانی و حفاظت بھی ایک اخلاقی ذمہ داری ہے : حادثہ، غلط فہمی یا غیر ذمہ دار قیادت کسی بھی لمحے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا سکتی ہے؛ تاریخ میں ایسے کئی واقعات (false alarms) پیش آ چکے ہیں جب دنیا ایٹمی جنگ کے قریب پہنچ کر بمشکل بچی۔ دہشت گرد گروہوں کے ہاتھ ایٹمی مواد یا کیمیائی مادے لگنے کا خطرہ اس ذمہ داری کو اور سنگین بنا دیتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات کی روشنی میں جائزہ

اسلامی جنگی اخلاقیات نے وہ اصول چودہ سو سال پہلے مقرر کر دیے جن کی روشنی میں یہ ہتھیار اخلاقی امتحان میں ناکام ہوتے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے" :جو تم سے لڑے اسی سے اللہ کی راہ میں لڑو اور حد سے تجاوز نہ کرو؛ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا) "البقرہ(190 :۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دس ہدایات میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور عبادت گزاروں کے قتل، درختوں کے کاٹنے اور آبادیوں کی تباہی کی صریح ممانعت موجود ہے۔ ان اصولوں کی رو سے ایسا ہتھیار جس کا استعمال غیر جنگجوؤں کے قتلِ عام اور فساد فی الارض کے بغیر ممکن ہی نہ ہو، اس کا استعمال شرعاً ناجائز ہے۔ جنیوا کنونشن اور کیمیائی ہتھیاروں کی ممانعت کے عالمی معاہدات (CWC) دراصل انہی اخلاقی اقدار کی عالمی توثیق ہیں۔ مسلمان مفکرین کی غالب رائے یہی ہے کہ انسانیت کی مشترکہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ان ہتھیاروں کے مکمل خاتمے (disarmament) کی طرف عملی پیش رفت کی جائے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ جوہری و کیمیائی ہتھیار انسانیت کے لیے کئی اخلاقی خطرات پیدا کرتے ہیں :وہ جنگجو و غیر جنگجو کا امتیاز مٹا کر اجتماعی قتل کو معمول بناتے ہیں؛ تابکاری و زہر کے ذریعے آئندہ نسلوں اور پورے ماحولیاتی نظام کو تباہ کرتے ہیں؛ خوف و دہشت پر مبنی امن قائم کر کے انسانی ضمیر کو جمود کا شکار کرتے ہیں؛ اور انسانیت کی فلاح کے وسائل کو تباہی کے آلات میں جھونک کر اسلحے کی دوڑ اور حادثاتی تباہی کے خطرات بڑھاتے ہیں۔ اسلامی جنگی اخلاقیات اور جدید بین الاقوامی انسانی قانون دونوں ان ہتھیاروں کو اخلاقی امتحان میں ناکام قرار دیتے ہیں۔ انسانیت کا اصل وقار اسلحے کی تباہ کاری میں نہیں بلکہ جان، نسل اور ماحول کے تحفظ میں ہے، اور یہی اخلاقی تقاضا دنیا کو ان ہتھیاروں کے خاتمے کی سمت لے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

سوال نمبر ۴ :اسلامی تعلیمات اور سیاسی عدم استحکام کی وجوہات کی توضیح 20) نمبر(

سوال نمبر ۴۔ اسلامی تعلیمات سیاسی عدم استحکام کی وجوہات کو کیسے واضح کرتی ہیں؟

تعارف

سیاسی عدم استحکام آج مسلم دنیا سمیت بہت سے ممالک کا مشترکہ مسئلہ ہے :حکومتوں کا بار بار بدلنا، اداروں کی کمزوری، احتجاج و انتشار اور عوام و ریاست کے درمیان بے اعتمادی۔ جدید سیاسیات اس کے اسباب معاشی اور ادارہ جاتی تجزیے سے بیان کرتی ہے، لیکن اسلامی تعلیمات — قرآن و سنت اور خلافتِ راشدہ کے تجربے — اس مسئلے کی جڑیں اخلاقی و دینی بنیادوں میں تلاش کرتی ہیں۔ اسلام کے نزدیک سیاست محض اقتدار کا کھیل نہیں بلکہ امانت، عدل اور خدمت کا نظام ہے؛ جب یہ بنیادیں کمزور ہوں تو عدم استحکام لازمی نتیجہ بنتا ہے۔ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات سیاسی عدم استحکام کی وجوہات کو کن اصولوں کی روشنی میں واضح کرتی ہیں۔

وجہ اول :عدل سے انحراف اور ظلم کا نظام

اسلامی تعلیمات کے مطابق سیاسی عدم استحکام کی سب سے بنیادی وجہ عدل کا فقدان ہے۔ قرآن مجید نے عدل کو ریاستی نظام کی روح قرار دیا اور حکمرانوں کو لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم دیا) النساء(58 :۔ ابنِ خلدون نے مقدمے میں لکھا ہے کہ ظلم تمدن و عمران کی تباہی کی علامت ہے؛ جب ریاست ظلم پر قائم ہو تو عوام کا اعتماد اٹھ جاتا ہے، پیداوار گھٹتی ہے اور بغاوت کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ حدیث میں مظلوم کی بددعا سے بچنے کی تنبیہ اسی اصول کا حصہ ہے۔ اسلامی تشریح یہ ہے کہ انحراف محض اخلاقی برائی نہیں بلکہ سیاسی نظام کے لیے زہر ہے : جہاں فیصلے میرٹ کے بجائے سفارش سے ہوں، کمزور کو انصاف نہ ملے اور طاقتور قانون سے بالاتر ہو، وہاں ریاست اپنی اخلاقی جوازیت (legitimacy) کھو دیتی ہے اور ہر بحران انتشار میں بدل جاتا ہے۔ اس کے برعکس عادلانہ نظام میں اختلاف بھی پرامن طریقے سے حل ہوتا ہے۔

وجہ دوم :شوریٰ سے انحراف اور استبداد

قرآن نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی پہچان" ان کا معاملہ باہمی مشورے سے ہوتا ہے) "الشوریٰ (38 :بیان کی ہے اور نبی کریم ﷺ کو بھی اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا) آل عمران(159 :۔ اسلامی تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ جب حکمران مشاورت ترک کر کے استبداد — یعنی اکیلا فیصلہ، اختلافِ رائے کا گلا گھونٹنا اور اداروں کو مفلوج کرنا — اختیار کرتا ہے تو سیاسی نظام میں داخلی تصحیح کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ غلطیاں جمع ہوتی رہتی ہیں، خوشامدی طبقہ حقائق چھپاتا ہے اور عوام کی ناراضی زیرِ زمین جمع ہو کر اچانک پھٹ پڑتی ہے۔ صحابہ کا دور اس کی مثبت مثال ہے جہاں خلیفہ کھلے عام سوال و جواب کا پابند تھا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک عام آدمی نے کپڑے کے بارے میں سوال کیا اور انہوں نے جواب دیا۔ جدید اصطلاح میں اسے شفافیت و جوابدہی (accountability) کہتے ہیں، جس کے بغیر استحکام ممکن نہیں۔

وجہ سوم :امانت میں خیانت — اقربا پروری اور بدعنوانی

اسلامی تعلیمات سیاسی عدم استحکام کی ایک اور بڑی وجہ امانت میں خیانت کو قرار دیتی ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں تک پہنچائی جائیں) النساء(58 :۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" :جب امانت ضائع کی جانے لگے تو

قیامت) تباہی (کا انتظار کرو"، اور وضاحت فرمائی کہ امانت ضائع کرنا یہ ہے کہ کام نااہل کے سپرد کر دیا جائے)بخاری(۔ جب ریاست میں مناصب اہلیت کے بجائے رشتہ داری، پارٹی وابستگی اور رشوت سے ملیں تو ادارے اندر سے کھوکھلے ہو جاتے ہیں؛ پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ عوام کی خدمت کے بجائے حکمران طبقے کے آلے بن جاتے ہیں۔ بدعنوانی وسائل کو ختم کرتی ہے، معاشی ناانصافی بڑھاتی ہے، اور عوام کے دلوں میں نظام کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے۔ اسلامی نکتۂ نظر سے کرپشن صرف قانونی جرم نہیں بلکہ ایک اجتماعی خیانت کا نام ہے جو ریاست کی بنیادوں کو کھا جاتی ہے اور بالآخر بغاوت و انتشار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

وجہ چہارم: معاشی ناانصافی اور قانون کی بالادستی کا فقدان

اسلامی تعلیمات سیاسی استحکام کو معاشی انصاف سے جوڑتی ہیں۔ جب دولت چند ہاتھوں میں سمٹ جائے، مہنگائی و بے روزگاری بڑھے اور بنیادی ضروریات بھی عوام کی پہنچ سے باہر ہوں تو سماج بے چینی فطری امر بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زکاۃ و صدقات اور ارتکازِ دولت کی ممانعت جیسے اصول دیے (الحشر(7 :۔ اسی طرح قانون کی بالادستی کا فقدان بھی عدم استحکام کی جڑ ہے :اسلام سکھاتا ہے کہ قانون حکمران سے بالاتر ہے؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر) فرض کرو (فاطمہ بنتِ محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا) بخاری و مسلم(۔ جہاں قانون طاقتور کے لیے نرم اور کمزور کے لیے سخت ہو وہاں دوہرا معیار قائم ہوتا ہے اور عوام کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ فرقہ واریت، لسانیت و قومیت کی بنیاد پر تقسیم) عصبیّت (کو حدیث میں جاہلیت قرار دیا گیا ہے؛ جب معاشرہ گروہوں میں بٹ جائے تو کوئی سیاسی نظام مستحکم نہیں رہ سکتا۔

وجہ پنجم :حکمران و عوام کے اخلاقی زوال کا باہمی تعلق

اسلامی تعلیمات کی ایک گہری نکتہ سنجی یہ ہے کہ سیاسی نظام کا استحکام حکمرانوں اور عوام دونوں کے اخلاق سے جڑا ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے" :بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے) "الرعد(11 :۔ اس اصول کی روشنی میں عدم استحکام صرف اوپر کی خرابی نہیں بلکہ پورے معاشرے کے اخلاقی زوال کا عکس ہوتا ہے :عوام میں جھوٹ، کام چوری، قانون شکنی اور شارٹ کٹ کی ذہنیت عام ہو تو ایماندار قیادت کا وجود بھی مشکل ہو جاتا ہے، اور فاسد قیادت معاشرے کو مزید بگاڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اطاعت و نظم کا ضابطہ بھی

واضح ہے :معروف) جائز (امور میں حکمران کی اطاعت نظام کو استحکام دیتی ہے، جبکہ ہر چھوٹے اختلاف پر انتشار پھیلانا خود تباہی کا سبب بنتا ہے۔ البتہ اسلام حکمران کے ظلم پر خاموشی کا بھی درس نہیں دیتا بلکہ نصیحت، احتساب اور پرامن اصلاح کے دروازے کھولتا ہے۔ یوں اسلامی تجزیہ عدم استحکام کو یک طرفہ نہیں بلکہ حکمران و رعایا کی مشترکہ ذمہ داری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات سیاسی عدم استحکام کے وجوہات کو اخلاقی و ادارہ جاتی اصولوں کی روشنی میں واضح کرتی ہیں :عدل کے بجائے ظلم، شوریٰ کے بجائے استبداد، اہلیت کے بجائے امانت میں خیانت و اقربا پروری، معاشی ناانصافی و دولت کا ارتکاز، قانون کی بالادستی کے بجائے دوہرا معیار، اور عصبیت و فرقہ واریت کی تقسیم — یہ سب وہ جڑیں ہیں جن سے انتشار پھوٹتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دائمی استحکام کا اسلامی نسخہ یہ ہے :عادلانہ نظام، مشاورتی حکومت، اہلیت پر تقرری، احتساب و شفافیت، قانون کی یکساں بالادستی اور معاشی انصاف۔ جس ریاست میں یہ اصول زندہ ہوں وہاں اختلاف بھی استحکام کا حصہ بنتا ہے، اور جہاں یہ مر جائیں وہاں اقتدار کی ہر تبدیلی انتشار لاتی ہے۔

سوال نمبر ۵ :تارکینِ وطن و مہاجرین :اسلام کی بنیادی ذمہ داریاں 20) نمبر(

سوال نمبر ۵۔ تارکینِ وطن اور مہاجرین کے مسئلے میں اسلام کن بنیادی ذمہ داریوں پر زور دیتا ہے؟

تعارف

ہجرت انسانی تاریخ کا قدیم مگر آج بھی زندہ مسئلہ ہے۔ جنگ، ظلم، قحط، معاشی بدحالی یا مذہبی دباؤ کی وجہ سے آج دنیا میں کروڑوں انسان اپنے وطن چھوڑ کر دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ادارے کے مطابق بے گھر و پناہ گزین افراد کی تعداد دس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اسلام نے اس مسئلے کو چودہ سو سال پہلے اپنے آغاز ہی میں حل کیا، کیونکہ خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ مہاجر تھے اور مدینہ کے انصار میزبان۔ ہجرت، مواخات اور انصار کی مثالوں سے اسلام نے مہاجرین کے معاملے میں ریاست، میزبان معاشرے، عالمی برادری اور خود مہاجرین کی ذمہ داریوں کا مکمل اخلاقی و قانونی خاکہ پیش کیا ہے، جس کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

ذمہ داری اول :پناہ دینا اور جان و عزت کا تحفظ

اسلام کی پہلی بنیادی ذمہ داری پناہ کے متلاشی کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ قرآن مجید نے حکم دیا" :اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو) "التوبہ(6 :۔ اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ پناہ اس شخص کو بھی دینے کا حکم ہے جو مسلمان بھی نہیں اور صرف سننے آیا ہے؛ پھر اسے زبردستی روکنے کے بجائے اس کے محفوظ مقام تک پہنچانا بھی ذمہ داری قرار دیا گیا۔ حدیث میں ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان و ہاتھ سے دوسرے محفوظ رہیں، اور" مہاجر "کی تعریف بھی اسی تحفظ سے جوڑی گئی۔ عملی مثال حبشہ کی ہجرت ہے جہاں عیسائی بادشاہ نجاشی نے مسلمان مہاجرین کو پناہ دی اور قریش کے وفد کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس انصاف پسندی کو ہمیشہ سراہا۔ اس اصول کی روشنی میں مہاجر کو دھکے دے کر موت کے منہ میں واپس بھیجنا (refoulement) اسلامی اخلاقیات کے خلاف ہے۔

ذمہ داری دوم :مواخات و معاشی کفالت - میزبان معاشرے کا فریضہ

دوسری بڑی ذمہ داری مہاجر کی معاشی بحالی ہے۔ مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات) بھائی چارہ (قائم کیا؛ انصار نے اپنے گھر، باغات اور دولت میں مہاجر بھائیوں کو شریک کیا، یہاں تک کہ بعض انصار نے اپنی آدھی دولت پیش کر دی۔ قرآن نے انصار کی اس ایثار کی تعریف ان الفاظ میں کی" :اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود انہیں سخت ضرورت ہو) "الحشر(9 :۔ اسی سورت میں مالِ فئی کے مستحقین میں" فقراء مہاجرین " کا خصوصی ذکر آیا ہے۔ اس سے اصول ثابت ہوتا ہے کہ مہاجر کی کفالت محض خیرات و احسان نہیں بلکہ اس کا حق ہے جو اولاً میزبان ریاست کے بیت المال) سرکاری خزانے (اور پھر میزبان معاشرے کے ایثار سے ادا ہوگا۔ جدید دور میں اس ذمہ داری کی صورت یہ ہے کہ مہاجرین کو خیمہ بستیوں میں غیر معینہ مدت تک سڑنے نہ دیا جائے بلکہ انہیں روزگار، تعلیم و علاج کی سہولتیں دے کر معاشرے کا فعال حصہ بنایا جائے۔

ذمہ داری سوم :مہاجر کی قانونی حیثیت اور حقوق کی برابری

اسلام مہاجر کو دوسرے درجے کا انسان نہیں سمجھتا۔ مدینہ کی ریاست میں مہاجرین کو مکمل شہری حقوق حاصل تھے؛ وہ بیت المال کے وظائف، عدالت کے انصاف اور سماجی شرکت میں انصار کے برابر تھے۔ قرآن نے مہاجرین کی

فضیلت بیان کر کے انہیں معاشرتی تعصب سے تحفظ دیا" :اور جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی سچے مؤمن ہیں) "الانفال(74 :۔ اس تعلیم کی روشنی میں میزبان معاشرے پر لازم ہے کہ مہاجرین کے ساتھ نسلی و قومی تعصب، نفرت انگیز مہم اور استحصال) کم اجرت، جبری مشقت (سے گریز کیا جائے۔ بچوں کی تعلیم اور عورتوں کی عزت کا تحفظ بھی اسی میں شامل ہے۔ نیز مہاجر کو اس کے عقیدے پر مجبور کرنا بھی جائز نہیں؛ پناہ کا بدلہ مذہب کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ ذمہ داری اجتماعی ہے :اگر کوئی طبقہ مہاجرین سے زیادتی کرے تو ریاست کا فرض ہے کہ اسے روکے۔

ذمہ داری چہارم :مہاجرین کی اپنی ذمہ داریاں

اسلام نے حقوق کے ساتھ مہاجرین پر بھی واضح ذمہ داریاں عائد کی ہیں تاکہ میزبانی کا نظام یک طرفہ نہ رہے۔ پہلی ذمہ داری میزبان ملک کے قوانین اور عوامی امن کی مکمل پاسداری ہے؛ پناہ دینے والے معاشرے میں فساد، جرم یا دہشت میں ملوث ہونا ناشکری اور عہد شکنی ہے، کیونکہ پناہ ایک امانت و معاہدہ ہے۔ دوسری ذمہ داری محنت و خود انحصاری ہے :مہاجر کو جتنی جلد ممکن ہو اپنی روزی خود کمانے کی کوشش کرنی چاہیے؛ مدینہ کے مہاجرین نے تجارت و مزدوری اختیار کی اور انصار کی مہمان نوازی کو دائمی بوجھ نہیں بنایا، حتیٰ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے پیشکش کے باوجود صرف بازار کا راستہ پوچھا اور اپنی محنت سے بڑے تاجر بنے۔ تیسری ذمہ داری میزبان معاشرے کی زبان، ثقافت و اقدار کا احترام اور سماجی ہم آہنگی کی کوشش ہے، اور چوتھی یہ کہ حالات سازگار ہونے پر اپنے وطن کی تعمیر و واپسی کی جائز جدوجہد سے غافل نہ ہوں۔

ذمہ داری پنجم :عالمی برادری اور دولت مند ریاستوں کا فریضہ

مہاجرین کا مسئلہ کسی ایک غریب میزبان ملک کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہے۔ پاکستان، ترکی، لبنان اور اردن جیسے ممالک دہائیوں سے لاکھوں افغان و شامی مہاجرین کی میزبانی کر رہے ہیں جبکہ وسائل رکھنے والے بہت سے ممالک سرحدیں بند رکھتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات" تعاون علی البر) "نیکی پر باہمی تعاون، المائدہ (2 :اور انسانی اخوت کے اصول کے تحت دولت مند ریاستوں و اداروں پر یہ ذمہ داری عائد کرتی ہیں کہ وہ میزبان ممالک کا بوجھ بانٹیں، مہاجرین کی مالی و طبی امداد کریں اور ان ممالک پر دباؤ ڈالیں جن کے ظلم و جنگوں نے ہجرت پیدا کی۔ مزید یہ کہ ہجرت کی اصل

وجوہات — ظلم، جنگ، مذہبی دباؤ، وسائل کی لوٹ — ختم کرنا بھی عالمی ذمہ داری ہے؛ اسلام عدلِ عالمی کا داعی ہے کیونکہ پائیدار حل پناہ کی فراہمی سے بڑھ کر ناانصافی کا خاتمہ ہے۔ وطن واپسی باعزت و رضاکارانہ ہونا بھی مہاجر کا حق ہے جس کی تیاری میں عالمی برادری کو کردار ادا کرنا ہوگا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تارکینِ وطن و مہاجرین کے مسئلے میں اسلام ان بنیادی ذمہ داریوں پر زور دیتا ہے (1) :پناہ کے طلب گار کو بلا امتیازِ مذہب تحفظ اور امن کی جگہ تک رسائی فراہم کرنا اور اسے جبراً خطرے میں واپس نہ بھیجنا؛ (2) مواخات و ایثار کی روح سے مہاجر کی کفالت و معاشی بحالی کو اس کا حق سمجھنا، جو اولاً ریاست اور پھر میزبان معاشرے کا فریضہ ہے؛ (3) مہاجر کو مکمل انسانی و قانونی حقوق دینا اور تعصب و استحصال سے بچانا؛ (4) مہاجرین پر قانون کی پاسداری، محنت و خود انحصاری اور میزبان معاشرے کے استحکام کی ذمہ داریاں؛ اور (5) عالمی برادری و دولت مند ریاستوں پر بوجھ بانٹنے اور ہجرت کی جڑوں — ظلم و جنگ — کو ختم کرنے کا فریضہ۔ مدینہ کی مواخات اس بات کی تاریخی شہادت ہے کہ اگر یہ ذمہ داریاں باہمی ایثار سے ادا کی جائیں تو مہاجرین بوجھ نہیں بلکہ میزبان معاشرے کی قوت بن جاتے ہیں۔